الایام: مجلس برائے تحقیق اسلامی تاریخ وثقافت، کراچی جلد:۳، شمارہ:۱، جنوری۔جون۲۰۱۲ء

مروجہ تحقیق کے مسائل

الایام کے گذشتہ شمارے کے تحقیقی نکات کا تجزیہ

محمد رضا تیمور ☆

جدیدیت نے انسان کی پرانے نظام سے جان چھڑا کر اسے نئی لیکن پرکشش الجھنوں میں ڈال دیا۔ پرانے نظام میں مذہب کی تعلیمات کو حتمی سمجھا جاتا تھا۔ الہامی اور دیومالائی مذاہب کے پیروکار اپنے اپنے انداز میں ان تعلیمات کے تحت اپنی زندگیاں گزارتے تھے۔ گو عمل میں تعلیمات سے انحراف بھی پایا جاتا تھا لیکن نظریے میں وہ آسمانی حقیقتوں کے قائل تھے۔ مذہب کو ماننے سے کوئی اور مقصد حاصل ہو نہ ہو بہت ساری الجھنوں سے انسان کی جان چھوٹ جاتی ہے۔ انسان کا آغاز کیا ہے اور انجام کیا ہوگا۔ مذہب اس کے بارے میں بڑا سیدھا سا تصور پیش کرتا ہے۔ جدیدیت نے جب مذہب کو زندگی کی عاملہ قوت ماننے سے انکار کر دیا تو اس نے اپنے پیروکاروں کو اس کھوج میں لگا دیا کہ انسان کا آغاز کیسے ہوا اور اس کا انجام کیا ہوگا نیز اس دونوں چیزوں کے پیش نظر اسے زندگی کیسے گزارنی چاہیے۔ کیونکہ پرانی تمام چیزوں کو ناقابل اعتماد ٹھہرا دیا گیا اس لئے ہر بات کی نئے سرے سے کھوج لگانے کا کام شروع کیا گیا۔ اسے ریسرچ کہتے ہیں جس میں ''سرچ شدہ'' چیزوں کو بھی مشکوک سمجھ کر ان کی دوبارہ 'تلاشی' لینے کو کہا گیا؛ اس طرح سے بنا ''ریسرچ''۔ مذہبی حوالے سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ 'ریسرچ' کا تصور مذہب کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے اور اس کی تشریح انسانی نظریات کی روشنی میں کرتا ہے۔

☆ الایام۔۴ میں محمد رضا تیمور کا نام سہواً تیمور رضا چھپ گیا تھا، تصحیح کر لی جائے۔ نیز ان کے نام کے ساتھ 'ڈاکٹر' کا سابقہ لگ گیا تھا، جس پر ادارہ معذرت خواہ نہیں بلکہ دعا گو ہے۔

ہو، وغیرہ، وغیرہ۔

۲۔ مجلّے میں شامل کرنے سے پہلے مقالات کی تنقیح کے عمل میں 'ایچ ای سی' خود بھی شامل ہو، مدیر کے لیے لازم کیا جائے کہ 'ماہرین' کی فہرست پہلے 'ایچ ای سی' سے منظور کروائی جائے اور منظور شدہ 'ماہرین' سے مقالے پر رائے حاصل ہونے کے بعد اس مقالے اور رائے کی نقل 'ایچ ای سی' کو مجلّے کی اشاعت سے قبل ارسال کی جائے تا کہ اخلاقی دباؤ اور سفارشوں کا سلسلہ ختم ہو۔

۳۔ اساتذہ کے تقرر اور خاص طور پر ترقی کے لیے پیش کردہ مقالات کی تنقیح 'ایچ ای سی' خود کرے اور اس کا فیصلہ حتمی ہو۔ اسے صرف جامعہ کی متعلقہ مجلس کے سپرد نہ کیا جائے کہ تاحال ہماری اخلاقیات قابلِ اعتماد نہیں۔ اس وقت اساتذہ کے ماہنامہ رسالوں میں چھپنے والے اور اخباری مضامین اور کالج و اسکول میگزین میں چھپنے والی تحریریں بھی 'تحقیقی مقالات' کے طور پر شمار میں آ رہی ہیں۔

۴۔ 'ایچ ای سی' کے لیے وہ مقالات بھی قابل قبول ہوں جو اساتذہ کسی بھی مجلّے میں شائع کروائیں۔ مقالے کے معیار کو اہمیت دی جانی چاہیے نہ کہ صرف 'ایچ ای سی' سے منظور شدہ مجلّے کو۔ بعض مقالات بہت جاندار ہوتے ہیں اور عام مجلّوں میں بھی شائع ہو جاتے ہیں۔ ان کی تنقیح کر کے ان کے معیار اور درجے کو طے کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ اساتذہ کی ترقی خود اساتذہ کے ساتھ ساتھ جامعہ اور طلبہ کے لیے بھی انتہائی اہم معاملہ ہے، اس لیے 'ایچ ای سی' ایک کڑا معیار رکھے اور مطلوبہ تعداد میں تمام مقالات کم از کم 'وائی' درجے کے ضرور ہوں۔ اور مدیروں کی جانب سے مقالات کی منظوری کی مد میں جاری ہونے والے خطوط کو اساتذہ کی ترقی کے معاملے میں کسی بھی شرط پر ہرگز شمار میں نہ لایا جائے۔ پھر ایک استاد کے لیے ہر عہدے سے اگلے عہدے میں ترقی کے لیے ایک مخصوص تعداد میں نئے مقالات لکھنے کا پابند بنانا بہتر ہوگا۔

۶۔ اساتذہ کی ترقی کے ضمن میں ایک اور منفی اقدام بھی قابلِ توجہ ہے کہ بدعنوان اساتذہ بالعموم اپنے فرضی مقالے پر جو انھوں نے کبھی نہیں لکھا، اپنے مقالات کی تعداد مکمل کرنے کے لیے، کسی مدیر سے اپنی کسی معذوری یا مجبوری کا رونا رو کر ایک ایسا خط حاصل کر لیتے ہیں جس میں مدیر یہ لکھ دیتا ہے کہ ان کا 'مقالہ' مجلّے کے اگلے یا فلاں شمارے میں شامل ہو رہا ہے۔ جو کبھی شائع نہیں ہوتا لیکن اس اثنا میں استاد کا کام پورا ہو جاتا ہے۔ یہ صورت ہمارے اطراف بالعموم دیکھنے سننے میں آتی ہے اور شاید اسی لیے یہ پابندی کبھی لگائی گئی تھی کہ ایک سال کے اندر وہ مقالہ شائع ہو جانا چاہیے، لیکن کہاں کوئی یونیورسٹی ماضی میں جا کر یا استاد کی ترقی کے بعد اس کے ایفائے وعدہ کو چیلنج کرتی ہے۔ اس لیے انصاف اور دیانت کا تقاضہ ہے کہ ترقی کے معاملے میں محض مدیر یا استاد کے وعدے کو شمار قطار میں ہرگز نہ لایا جائے۔

یہ ایک بہت ضروری اور ساتھ ہی ایک عبرت انگیز اقدام ہو سکتا ہے کہ 'ایچ ای سی' ایک جائزہ مرتب کرے اور جامعات سے تمام اساتذہ کی ترقیوں کا بالجبر ریکارڈ حاصل کرے کہ کس کس استاد نے مقالات کی اشاعت کے وعدوں پر کیا کیا ترقیاں حاصل کی ہیں؟ پھر ان اساتذہ سے وہ مطبوعہ مقالات طلب کرے جو وعدوں کے مطابق اسی عرصے میں چھپے ہوں۔ یہیں دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا اور ایسے سارے اساتذہ کا حقیقی کردار بلکہ یونیورسٹیوں کا رویہ بھی سامنے آ جائے گا۔ ایسے بدعنوان اساتذہ میں سے اگر کسی ایک کو بھی سزا مل جائے تو سب ٹھیک ہو جائیں گے اور یونیورسٹیوں کی بھی سرزنش ہو جائے گی۔

یہ محض چند پہلو ہیں جن پر 'ایچ ای سی' کا اصرار تحقیقی مجلّات کے معیار اور ان کی افادیت میں اضافے کا موجب بن سکے گا۔ اس طرح جو اخلاقی بگاڑ ہمارے اساتذہ اور یونیورسٹیوں میں عام ہو رہا ہے اس میں بھی کمی آئے گی۔ ہم نے بہت وقت اور بہت وسائل ضائع کر دیے اور یہ ہمارا قومی زیاں تھا۔ بہت ہو چکا، اب ہمیں پستی میں اور نہیں رہنا چاہیے اور نہ ہی مزید پستی میں گرنا چاہیے۔

مجلّوں کے معیار کی بہتری کے لیے، میری ان ساری معروضات کا لبِّ لباب یہ ہے کہ:

۱۔ 'ایچ ای سی' کو چاہیے کہ 'ایچ ای سی' خود مجلّوں کے لیے رہنما اصول وضع کرے کہ ان کی ترتیب میں کن کن امور کا لحاظ رکھا جائے۔ حواشی و اسناد کا اندراج کیسے ہو، اقتباسات کیسے دیے جائیں یا نہ دیے جائیں، فہرستِ اسنادِ محولہ کی ترتیب مصنف وار ہو، مصنفین کے نام حواشی و حوالوں میں کیسے لکھے جائیں اور اس میں دیگر اندراجات کیا کیا اور کس ترتیب سے ہوں اور خلاصہ (Abstract) کس جگہ تحریر

ان کے شمار کو ہی لازمی قرار نہ دیا جائے، کیوں کہ کوئی بھی مجلّہ، خاص طور پر اردو مجلّے، تاحال عالمی معیار کے نہیں ہیں۔ اس طرح صرف ہماری اخلاقیات بگڑ رہی ہیں اور نہ صرف مجلّوں کا معیار بلکہ اساتذہ اور ان کی تحقیقات کا معیار بھی بلند نہیں ہو رہا ہے۔ اساتذہ کے تقرر یا ترقی کے لیے ان کے مقالات کی انفرادی تنقیح، چاہے وہ 'ایچ ای سی' سے منظور شدہ مجلّوں میں شائع ہوئے ہوں یا کسی بھی مجلّے میں، 'ایچ ای سی' کو اپنے مخصوص ماہرین سے خود کرانی چاہیے اور اس کے بعد ان کے مقالات کو ان کے معیار کی درجہ بندی کے اعتبار سے، ان کی ترقی یا دیگر کسی نوعیت کے فوائد کے لیے شمار کے قابل سمجھا جانا چاہیے۔ ورنہ بعض صورتوں میں یہ ناانصافی بھی ایک واقعہ ہے کہ اساتذہ کے ایسے مقالات جو بہت معیاری ہو سکتے ہیں کہ انھیں کم از کم 'وائی' درجے کے مجلّے میں شائع ہونا چاہیے لیکن کسی وجہ سے وہ صرف 'زی' درجے کے مجلّے میں شائع ہوتے ہیں، یا کوئی مقالہ 'زی' درجے کا بھی اہل نہیں ہوتا مگر وہ 'وائی' میں چھپ جاتا ہے، تو ایسی صورت میں مجلّے کے درجے کے بجائے خود مقالے کے معیار کو ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔ یوں اساتذہ میں اپنے مقالات کی 'ایچ ای سی' سے منظور شدہ مجلّوں میں اشاعت کے لیے غیر اخلاقی تگ و دو بھی باقی نہ رہے گی اور مجلّوں کے مدیروں پر سے بھی غیر اخلاقی دباؤ ختم ہو جائے گا اور اس طرح مجلّوں کے معیار میں بہتری آ سکے گی۔

۴۔ اساتذہ کی ترقی کے معاملے میں جامعات اور 'ایچ ای سی' کو بہت حساس ہونا اور اپنا معیار بہت کڑا رکھنا چاہیے تاکہ صرف اہل اور مستعد اساتذہ ہی ترقی پا سکیں اور اعلیٰ مناصب تک پہنچ سکیں۔ اس لیے ترقی کے لیے 'ایکس' درجے یا کم از کم 'وائی' درجے کے مقالے ہی کو قابلِ قبول سمجھا جانا چاہیے۔

۵۔ مقالات کے ذریعے ترقی کے ضمن میں یہ امر بھی 'ایچ ای سی' کو لاگو کرنا چاہیے کہ جو مقالات کسی ایک عہدے سے دوسرے عہدے میں ترقی کے لیے پیش کیے جا چکے ہوں، انھیں دوسرے سے تیسرے عہدے کے لیے پیش کرنے کی اجازت یا رعایت نہ دی جانی چاہیے۔ ہر عہدے کے دوران ایک مخصوص تعداد میں نئے مقالات چھپوانا ضروری قرار دیا جانا چاہیے۔ اس طرح پروفیسر کے عہدے پر ترقی کے لیے بحیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر ایک خاص تعداد میں نئے مقالات شائع کروانا ضروری ہونا چاہیے۔ اور پھر پروفیسری کے دوران بھی نئے مقالات چھپنے پر ہی ایک استاد کو اگلے اسکیل (جیسے ۱۲ سے ۲۲ میں) میں ترقی کے قابل سمجھا جانا چاہیے۔

پڑھنے تک ہی محدود رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں سائنس کے طالبعلم جب اپنے مضامین میں کوئی تیر مارنے سے قاصر رہتے ہیں تو وہ پھر ادب اور مذہب کو مشق ستم ٹھہرا لیتے ہیں۔ زعم یہ ہوتا ہے کہ ادب والے تو صرف اردو جانتے ہیں جبکہ ہم اردو بولنے اور مسلمان ہونے کے ساتھ سائنس سے بھی دعا سلام رکھتے ہیں پھر ہمارا مقابلہ کون کرسکتا ہے۔ اسلئے وہ اس میں کچھ 'نیا' کرنے کے چکر میں پڑجاتے ہیں۔ جیسے کہ صفوان احمد چوہان نے تفسیر کے بارے میں لکھا کے کہ جو 'نیا' کرنا چاہتے ہیں ان کو پذیرائی نہیں ملتی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے اس ضمن میں جن ناموں کو گنوایا ہے سوائے غامدی کے اور کسی حد تک اصلاحی صاحب کے باقی لوگ اس 'نئے' منہج کو نہیں مانتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تفسیر بھی باقی علوم کی طرح ایک باقاعدہ علم ہے اور اس کا مستند طرز وہی ہوگا جو اسے قائم کرنے والوں نے اپنایا۔ نئے پہلو سامنے آسکتے ہیں لیکن قدما کی سند کے ساتھ۔ اور اگر ہم قدما کو کسی خاطر میں نہیں لانا چاہتے تو اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ ہم فزکس کے مطالعے میں نیوٹن اور آئین سٹائین کو یک لخت اٹھا کر پرے پھینک دیں کیونکہ وہ میرے 'نئے' کی تصدیق نہیں کرتے۔ آئن سٹائن نے اگر نیوٹن کی کلاسیکل فزکس کی جگہ اپنی کوانٹم فزکس کو پیش کیا تھا تو ایسا ہرگز نہیں تھا کہ اس نے نیوٹن کو غیر معتبر قرار دے دیا تھا۔ آئن سٹائن اپنا کام کسی انجام تک نہیں پہنچا سکتا تھا جب تک کہ وہ نیوٹن کی فزکس کا سہارا نہ لیتا اور یہی پچھلوں سے سند حاصل کرنا ہوتا ہے۔ بشیرالدین صاحب مفسر تو درکنار شاید افلاکیات کی مہارت کے دعوے کو بھی مشکل سے ہی ثابت کر پائیں کیونکہ افلاکیات کی دریافتوں میں ناسا جن آلات کو ناگزیر بنا چکا ہے وہ ہم جیسوں کے پاس اسی وقت آسکتے ہیں جب ہماری ناسا تک رسائی ہو جبکہ وہ کسی 'مفسر' کو اپنے ہاں گھسنے نہیں دیتے۔ اس کے بعد ہماری تحقیق ناسا کی شائع کردہ رپورٹوں تک ہی محدود رہ جاتی ہے۔ علاوہ ازیں سائنسی دریافتوں سے، جو کہ کبھی بھی حتمی ہونے کا دعوی نہیں کرسکتیں، ایک ایسے صحیفے کی تصدیق کرنا جس کا حتمی ہونا اس کے پیروؤں کا ایمان ہو اس صحیفے کو مشکوک کردینے کے مترادف ہے۔ قرآن کو کسی تصدیق کی ضرورت نہیں لیکن شاید یہ نکتہ سائنس زدہ لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے۔

مضمون کے آغاز میں صنفی معاملے میں تبصرہ نگار نے جو زبان اپنائی ہے واضح طور پر غیر ثقہ ہے۔ یہ بات مذہبی حوالے سے نہیں بلکہ ادبی حوالے سے ہی ہے۔ شاید انہوں نے اپنی جنس شناسی یا حسن شناسی کا ثبوت دینے کی کوشش کی ہے جو بڑی ہی بھونڈی محسوس ہوتی ہے۔ حسن شناسی اور صنف

کتب کے تبصرے میں ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر نے ڈاکٹر مبارک علی کے دیباچے کا بہت عمدہ محاکمہ کیا ہے۔ اپنے شستہ انداز اور روانی تحریر کی خوبیوں کے باوجود موصوف بے پر کی چھوڑنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنی انگریزی کی ایک کتاب Pakistan in serach of identity میں رقم طراز ہیں کہ مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ کو ان کے اپنے عہدوں میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ یہ ہندو مسلم تفریق کو گہرا کرنے کا شاخسانہ ہے کہ آج ان لوگوں کے بڑے بڑے تذکرے پائے جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ دروغ عیاں ہے اس کو مزید واضح کرنے کی ضرورت نہیں۔

محمد شکیل اوج صاحب کے فہم دین پر اس شمارے میں بھی حامد علی فاروق صاحب نے لے دے کی ہے جبکہ ان کا حالیہ مضمون پھر انہیں مسائل کا شکار نظر آتا ہے۔ امام ابوحنیفہ کی قرآن فہمی کی انہوں نے جو توجیہہ کی ہے اس سے شاید امام صاحب خود بھی بے خبر ہوں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ مقالہ نگار کے دلائل کا حوالہ براہ راست امام صاحب تک نہیں جاتا۔ یہ امام صاحب کا بے جا دفاع ہے اور search کئے بغیر research والی بات ہے۔ امام صاحب اسلاف میں سے ہیں اور اسلاف میں سے ہونا بذات خود ایک دلیل ہے ان کا دفاع کرنا یا انہیں کسی کے مقابلے میں بڑھانا گھٹانا ان کی قرآن فہمی کو مشکوک کرنے والی بات ہے۔ مثال کے طور پر پردے کا معاملہ لیں تو شروع اسلام سے اس پر دو رائیں پائی جاتی ہیں حتی کہ صحابہ بھی اس بارے میں دو رائے رکھتے تھے پھر اس پر مغز کھپانے کا کیا محل؟۔ اصل میں مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس پر زیادہ توجہ اس لئے دیتے ہیں کہ جدیدیت نے عورت کو لباس سے بے نیاز کر دیا؛ تو ہم جو جدید دنیا کا پانی بھرتے ہیں وہ اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ عورت کا چہرہ ہی کھول دیں۔ جو دلائل مقالہ نگار نے اس ضمن میں پیش کئے ہیں ضروری تھا کہ انہیں امام ابوحنیفہ سے ثابت کیا جاتا اور اگر ایسا نہیں کیا گیا تو یہ مقالہ نگار کی اپنی قرآن فہمی ہے نہ کہ امام ابوحنیفہ کی۔ باقی رہی قرآن سے کوئی چیز ثابت کرنے کی بات تو کرنے والے اس سے زنا کو بھی ثابت کر لیتے ہیں۔

آخر میں اس تبصرے کے بارے میں کچھ کہنے کی جسارت کریں گے جو بزعم خویش ایک باادب کے قلم سے برآمد ہوا ہے۔ یہ ادب، تاریخ اور مذہب بھی انتہا درجے کی یتیمی کا شکار ہیں کوئی بھی انہیں اپنے گھر لا کر ڈال لیتا ہے اور ان بیچاروں کو اس کا ممنون احسان ہونا پڑتا ہے۔ مغربی طاقتوں نے سائنسی علوم میں تحقیق کو ایسی لیبارٹریوں کا محتاج بنا دیا کہ ترقی پذیر ممالک ان کے کئے ہوئے تجربات کو

پھیلتی ہوئی شاخیں تھیں نہ کہ نئے درختوں کی کاشت کیونکہ سرمائے کی انڈسٹری سے نکلنے والے نادوں نے ذہنوں کی زمین کو کسی فصل کی کاشت کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ اس خای پر پردہ ڈالنے کے لئے جدید لوگوں نے 'بعدجدیدیت' postmodernism کی اصطلاح کا سہارا لیا۔ Modern Day Dictionary of Received Ideas میں اس اصطلاح کے تحت لکھا ہے کہ اس کے کوئی معنی نہیں جیسے چاہے اسے استعمال کریں۔ اس اصطلاح کی آڑ میں اس کے مصنفین نے پیچیدہ قسم کی اصطلاحات کو وضع کیا اور پھر ان پر بحث بھی پیچیدہ قسم کے الفاظ سے کی جس سے مسئلہ عام قاری کی سمجھ سے بالاتر ہوگیا کہ کیا فرمایا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ 'خاص' قاری بھی اسے سمجھنے کا ناٹک ہی کرتے ہیں۔ دلائل کے دیوالیہ پن نے اصطلاحوں کا سہارا لینے کی کوشش کی جو بظاہر کامیاب ٹھہری کیونکہ جدیدیت کے مشرقی وفادار تو ابھی 'سرچ' سے ہی فارغ نہیں ہوئے کہ ان اصطلاحوں کے کھیل کو سمجھتے۔ ابھی وہ اس مسئلے سے نہیں نکلے کہ قرآن میں کن چیزوں کا ذکر کتنی مرتبہ آیا ہے؛ ابھی قرآن سے عورت کا مقام طے ہورہا ہے اور ابھی تعلیم وتربیت کے بارے میں اسلام کی روشنی میں کوئی ٹھوس رائے قائم نہیں کی جاسکی وغیرہ وغیرہ۔

اصلاحی صاحب نے ایک عمدہ آغاز کے بعد اس میں شاید زیادہ وقت الجھانا مناسب نہیں سمجھا۔ تحقیق کے معنی ومفہوم اور اس کے تقاضوں کی بحث غیر محل نظر آتی ہے۔ تحقیق کے تقاضے اخلاقی نوعیت کے بیان ہوئے ہیں نہ کہ فنی نوعیت کے۔ یہ عجیب بات ہے کہ مضمون کا ایک بڑا حصہ کتب خانوں کی تفصیل کے لئے مختص کردیا گیا حالانکہ تحقیق کی شدبد رکھنے والا اس امر سے بخوبی واقف ہوتا ہے کہ اسے اپنے مواد کے لئے کتب خانوں سے رجوع کرنا ہے۔ ظاہر ہے دلائل سے خالی ذہنوں کے لئے کتب خانے ہی ایک سہارا ہیں۔ جن کے پاس دلائل ہیں وہ اپنے دلائل سے ہی ایک جہان آباد کرلیتے ہیں۔ اسلام کے روایتی عہد میں علم کے حوالے سے جو بڑے بڑے نام گزرے ہیں ان کے پاس اتنے بڑے بڑے کتب خانے ہرگز نہیں تھے۔ ان کے پاس علم کی روایت تھی جو انبیا تک جاتی تھی۔ اس روایت کی تشریح سے وہ حکمت کے موتی دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے جس کا لوہا دنیا آج تک مانتی ہے۔ لہٰذا کتب خانے اس وقت تک بے کار ہیں جب تک دل و دماغ کی لائبریری پر قفل پڑا ہوا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ نفس مضمون موضوع بحث سے زیادہ تر غیر متعلق ہی رہا۔

یوں دن بدل گئے؛ جن چیزوں پر کسی کو شک کرنے کی مجال نہ تھی انہیں ہی سب سے پہلے مشکوک ٹھہرا دیا گیا۔ ہماری مراد آسمانی ہدایت سے ہے وہ الہامی کتابوں کی شکل میں ہو یا دیومالائی قصوں کی۔ اسی تناظر میں ''الایام'' کے چوتھے شمارے میں آنے والے مضامین میں تحقیق سے متعلق پائے جانے والے نکات کا تجزیہ حاضر خدمت ہے۔ بات ریسرچ سے ہی شروع کریں تو اس کا اردو متبادل تحقیق ہے لیکن لفظ 'تحقیق' کے مادے سے اس کا کوئی تعلق نہیں کجا کہ اس کی تشریح میں قرآنی آیات کو پیش کردیا جائے۔ قرآن یا کوئی بھی الہامی کتاب اس کے ماننے والوں کے لئے ایک ثابت شدہ چیز ہے اسے پھر سے ثابت کرنا اسے مشکوک کردینے کے مترادف ہے جس کی الہامی کتابوں کے راسخ العقیدہ اذہان بالکل اجازت نہیں دیتے۔ لہٰذا تحقیق کو صرف ایک متبادل کے طور پر ہی استعمال کیا جاسکتا ہے؛ اس کے مبدا کو ریسرچ کی اصطلاح سے ملانا تناظر کی غلطی ہے۔ ہمارے زیر بحث ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی صاحب کا مضمون ہے جس میں انہوں نے تحقیق کے خدوخال واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا آغاز جاندار تھا جسے کہ انہوں نے اسی تناظر میں پیش کیا جسے ہم اوپر زیر بحث لا چکے ہیں۔ اس تناظر کا لب لباب یہ ہے کہ روایتی اور جدید نظریہ علم میں بنیادی فرق دونوں کی افادیت utilization کا ہے۔ روایتی نظریہ علم کا ہدف شعوری ترقی تھا جبکہ جدید نظریہ علم مادی ترقی کو سامنے رکھتا ہے۔ research سے شروع ہونے والا سفر پہلے published پھر approved سے ہوتا ہوا impact factor تک آ گیا۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جدید نظریہ علم یکدم ہی اس نتیجے پر نہیں پہنچا بلکہ جدیدیت کو پروان چڑھانے والے شعور کی دنیا کے ہی لوگ تھے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ روایتی مذہبی ماحول کے باشندے تھے جنہیں یا تو روایت کی شدت نے کچھ اور سوچنے پر مجبور کردیا تھا یا پھر وہ روایت سے اکتا گئے تھے۔ دونوں میں سے کونسی وجہ ممکنہ ہے یہ ایک گہرے مطالعے کی بات ہے جس کا کہ یہاں محل نہیں۔ بلاشبہ جدیدیت کی بنیاد رکھنے والوں نے دلائل کا ایک جہان آباد کیا جنہیں مذہب کے ماننے والے سچے تو تسلیم نہیں کرسکتے تھے البتہ ان کے سچے original ہونے میں کسی کو تامل نہ ہوا اور یہی چیز مذہبی دنیا میں جدیدیت کی سرایت کا سبب بن گئی۔ البتہ دلائل کا یہ سچا پن اس وقت دھندلانے لگا جب جدیدیت میں سرمایہ دارمی کی روح مکمل طور پر سرایت کرگئی۔ اب جو کچھ تھا وہ پہلے سے لگے درختوں کی

مخالف کو مخاطب کرنے کے بڑے عمدہ اسلوب اردو میں موجود ہیں لیکن کیا کریں کچھ 'نئے' کا۔ 'صنف غیر کرخت' کی ترکیب معلوم نہیں تبصرہ نگار نے جنسیات کی کس لغت سے اخذ کی ہے۔ جہاں تک معاملہ ہے ان کی تبصرہ نگاری کا تو پطرس بخاری کا 'میبل اور میں' میں پیش کیا گیا تصور بڑے بڑے تبصروں کو نمٹا دیتا ہے۔ دو چار افسانہ نگار یا نثر نگار کے اقتباسات نقل کریں تین چار بیرونی ادیبوں خاص طور پر وہ جو کسی دوسری زبان سے تعلق رکھتے ہوں، کا حوالہ دیں؛ اس کے ساتھ کچھ اپنی وضع کی گئی ترکیبیں استعمال کریں؛ تبصرہ نگاری اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ پڑھنے والے بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں چوہان صاحب کے تبصرے سے ڈاکٹر انوار احمد کی افسانہ نگاری کا کوئی قابل ذکر تعارف یا خاکہ ذہنوں میں نہیں ابھرتا۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حالیہ عشروں کے شعرا اور ادیب کیا کوئی اچھوتی فکر رکھتے ہیں؟۔ 'آزاد طرز'، 'مابعد از جدیدیت' اور 'علامتی تحریروں' نے ایسا ماحول پیدا کر دیا کہ کوئی کچھ بھی کہہ جائے وہ تخیل کا کمال قرار پا جاتا ہے۔ اس پر گمان ہوتا ہے کہ غالب، اقبال اور فیض تو تخیل کی اس بلندی سے ورے ہی تھے۔ جی حضوری کا جو چلن ہمارے ہر شعبہ زندگی میں جاری وساری ہے اس نے ادب کو بھی اپنے گھیرے میں لے لیا ہے کہ یاران نکتہ داں ہر بات پر سر ہی دھنتے ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر صاحب کا یہ فقرہ جو نقل ہوا، ''لفظ جگہ جگہ نیلام ہو رہے تھے۔۔۔ اسلحے کے سوداگر بھی لفظ بیچ رہے تھے، فجر کے نمازیوں پر پھینکنے کے لئے''، تشریح طلب ہے۔ میری گزارش ہے کہ جنہیں ادب شناسی کا زعم ہے وہ اردو ادب کے سیاق وسباق میں وضاحت کریں کہ یہ فقرہ کیا کسی تصور کو ذہنوں میں اجاگر کرتا ہے؟۔

الایام: مجلس برائے تحقیق اسلامی تاریخ وثقافت، کراچی جلد:۳، شمارہ:۱، جنوری۔جون ۲۰۱۲ء

نئی کتابیں

(نئی کتابوں کا مختصر تعارف)

محمد سہیل شفیق

۱۔ کلکی اوتار اور حضرت محمد ﷺ، مصنف: ڈاکٹر وید پرکاش اپادھیائے، ۱۴۳۲ھ/ ۲۰۱۱ء، لاہور: بیت الحکمت، صفحات: ۷۲

کلکی اوتار بھارت میں شائع ہونے والی ایک عالم فاضل ہندو پنڈت وید پرکاش اپادھیائے کی کتاب ہے۔ جسے پاکستان سے بیت الحکمت لاہور نے شائع کیا ہے۔ وید پرکاش بنگال کے رہنے والے ہندو برہمن ہیں اور الہ آباد یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہ کتاب انھوں نے برسوں کی تحقیقات کے بعد لکھی اور شائع کی ہے اور اشاعت سے قبل، کم از کم آٹھ دوسرے فاضل پنڈتوں نے اس کا مطالعہ کرنے کے بعد وید پرکاش کے دلائل سے کلی اتفاق کا اظہار کیا ہے اور مصنف کی جانب سے پیش کیے جانے والے تمام نکات کو درست قرار دیا ہے۔

وید پرکاش لکھتے ہیں:

''پیش نظر تحقیقی کتاب میں قدیم ہندوستانی روایات اور اسلامی روایات کے امتزاج کو پیش کیا گیا ہے۔ اسلامی روایات میں جو مقام رسولوں، نبیوں یا پیغمبروں کا ہے وہی مقام ہندوستانی روایات میں اوتاروں کا ہے۔ مسلمان حضرت محمد ﷺ کو آخری نبی یا خاتم النبیین مانتے ہیں اور ہندوستان میں کلکی کو آخری اوتار کہا گیا ہے۔ حضرت محمد ﷺ آخری نبی ہیں۔ اس حقیقت کو جان کر مجھے شوق پیدا ہوا کہ کلکی اوتار کے متعلق سیرت کا مطالعہ پرانوں میں کیا جائے۔ ہندوستانی روایات